اصلاحِ تعلیم کی تحریک میں شبلیؒ کا کردار

محمد نذیر کاکاخیل

"کسی چیز کی خرابی کا اثر عموماً ابتداء میں ظاہر نہیں ہوتا بلکہ یہ اثر پہلے پیدا ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ بڑھتا ہے یہاں تک کہ بالآخر علانیہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ موجودہ نصاب کی خرابی کا اثر پہلے ہی شروع ہو گیا تھا جس کی بدیہی دلیل یہ ہے کہ جس دن سے یہ نصاب جاری ہوا عین اس وقت سے علم تنزل شروع ہو گیا جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔"[1] یہ ہیں وہ تاثرات جو مولانا شبلیؒ نے "ندوۃ اور نصابِ تعلیم" کے عنوان سے اپنے ایک مقالے میں قلمبند کئے۔ ندوۃ کے قائم کرنے کی سب سے بڑی ضرورت بقول شبلیؒ "نصابِ تعلیم کی اصلاح تھی"۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غیر منقسم ہندوستان میں نہ تو دینی مدارس کی کمی تھی اور نہ ہی بنگ مدارس اور "علی گڑھ تحریک" کی موجودگی میں کسی مزید جدید ادارے کی ضرورت تھی کیونکہ ایک ط اگر خالص دینی تعلیم دی جاتی تھی تو دوسری طرف دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ طلباء کو جدید تع زیور سے بھی آراستہ کیا جاتا تھا۔ قدیم مدارس کی مخالفت اور ان کی اصلاح کی ضرورت کو محسوس ہوئے سید سلیمان ندویؒ کی اس رائے سے اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ "مولانا سے پہلے ہمارے علماء پر اتنی چھا گئی تھی کہ ان کی نظر درسی کتب اور ان کے شروح و حواشی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی کتابوں کے علاوہ کسی نئی کتاب کا دیکھنا اور علم و فن کی کتاب سے استفادہ، قلمی کتابوں کی تلاش ا کتب کے مطالعہ کا شوق عموماً ناپید تھا۔"[2] اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ "علی گڑھ تحریک" —

---

[1] مقالاتِ شبلی، جلد اول، اعظم گڑھ ۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۰ء، ص ۱۲۶ و بعد

[2] سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، اعظم گڑھ ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء، ص ۳۶

ـفت کیوں تھی جبکہ آغاز میں انھوں نے "علی گڑھ تحریک" کا ساتھ دیا تھا۔ اس کا جواب معلوم کرنے
ـ لئے ضروری ہے کہ ہم مختصراً اس ماحول کا جائزہ لیں جس میں شبلی مرحوم نے پرورش پائی اور جہاں
کے افکار پروان چڑھے۔

شبلی نعمانیؒ نے مروجہ نظام کے تحت تعلیم حاصل کی۔ مختلف انداز فکر کے لوگوں سے انہیں
ـطہ پڑا۔ دائرۂ احباب واساتذہ بڑا وسیع تھا یہی وجہ تھی کہ ان کا ذہن محدود نہیں تھا اور وہ قوت
ـی سے برے بھلے میں تمیز کے قائل ہو کر آغاز ہی میں فکری تنگ نظری کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ چنانچہ جب
ـوں نے سرسید کی علمی تحریک کا دور سے مطالعہ کیا تو انہیں اس میں بہت سے ایسے افکار نظر آئے جو ان کے
ـپے تھے اور انہیں اس تحریک میں گویا اپنے افکار کو عملی جامہ پہنانے کی ایک کرن دکھائی دی۔ علی گڑھ پہنچ
شبلیؒ اپنے اس خواب کی پوری تعبیر تو نہ دیکھ سکے البتہ انہیں وہاں یورپ کے افکار و علمی تحقیقات
سے روشناسی کا موقع ضرور مل گیا۔ سب سے بڑھ کر جو فائدہ پہنچا وہ پروفیسر آرنلڈ (ARNOLD)
جیسے انگریز عالم کی رفاقت تھی۔ پروفیسر آرنلڈ نے شبلیؒ کو جدید تحقیق کے رموز بتا دیئے اور شبلیؒ نے
نہیں اپنے لئے رہنما اصول بنا لیا اور خود مولانا سے پروفیسر موصوف نے عربی میں استفادہ کیا[۳] علی گڑھ
تحریک کا دوسرا اثر ان پر یہ ہوا کہ انگریزی تعلیم کی ضرورت ان پر عیاں ہو گئی اور لوگوں کو اس پر آمادہ
رنے کے لئے کمربستہ ہو گئے۔ یہ تو تھا علی گڑھ میں ان کا مثبت پہلو یعنی انھوں نے جدید علوم اور
نگریزی زبان کی افادیت کو قبول کر لیا لیکن ساتھ ساتھ "علی گڑھ تحریک" کی کمزوریوں کا بھی قریب
سے جائزہ لینے کا موقع مل گیا۔ اور جوں جوں وقت گزرتا رہا شبلی پر اس کی خامیاں آشکارا ہوتی
رہیں۔ چنانچہ اپنے ایک عزیز کو لکھتے ہیں:۔

"یہاں آکر میرے تمام خیالات مضبوط ہو گئے، معلوم ہوا کہ انگریزی خواں فرقہ
نہایت مہمل فرقہ ہے، مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی
ترقی کا جوش برائے نام نہیں، یہاں ان چیزوں کا ذکر تک نہیں آتا بس خالی کوٹ پتلون
کی نمائش گاہ ہے۔ ہمارے شہر کے نوخیز لڑکے مجھ کو بی۔ اے کی نسبت یہ خیال دلاتے تھے

---

[۳] حیاتِ شبلیؒ۔ ص ۱۴۰-۱۳۹

کہ وہ مذہبی باتوں کو تمام تر ضعیف ثابت کر دیں گے۔ لاحول ولاقوۃ ...... وہ غریب تو زمین کی حرکت بھی نہیں سمجھ سکتے ...... (سر سید) فرماتے ہیں کہ انگریزی ان کے دماغوں میں کچھ تبدیلی نہیں پیدا کرتی۔"[۴]

شبلیؒ کی اس شکایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے جدید طرزِ تعلیم کا خاکہ ان کے ذہن میں تھا وہ علی گڑھ میں چند نامعلوم دشواریوں کی بنا پر پورا ہوتا دکھائی نہ دیا۔ جن امیدوں سے علی گڑھ گئے تھے اتنی ہی نامرادیاں لے کر واپس لوٹے اور بعد میں علی گڑھ تحریک کی مخالفت کرنے لگے۔ شبلیؒ کے اس طرزِ عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے شیخ محمد اکرام صاحب لکھتے ہیں:

"علی گڑھ کے پست علمی معیار سے مولانا شبلی کو جو شکایتیں تھیں ان سے ہم متفق لیکن انصاف کا تقاضا ہے کہ اس امر کا بھی اظہار کر دیا جائے کہ شبلی نے اس کے متعلق جو عمل اختیار کیا تھا اس سے اس کمی کی اصلاح ہرگز نہ ہو سکتی تھی۔ علی گڑھ کی اس کوتاہی کرنے کا عملی طریقہ تو یہ تھا کہ شبلی اپنے قیام کے دوران اس کا سدّباب کرتے یا علی گڑھ آجانے کے بعد جب نواب محسن الملک انہیں بار بار بلاتے تھے اس وقت وہاں جاکر چند موزوں کی علمی تربیت کرتے۔ شبلی سے یہ نہ ہوا صرف یہی نہیں بلکہ علی گڑھ کے متعلق ان کی شکایتیں پڑھنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ان شکایتوں سے علی گڑھ کی اصلاح اس قدر مقصود نہ تھی قدر علی گڑھ کے مقابلے میں اپنے "ندوۃ" کی فوقیت دکھانا۔"[۵]

اکرام صاحب کی رائے اپنی جگہ درست لیکن جو کام شبلی علی گڑھ سے باہر کر سکتے تھے علی گڑھ کے اندر کبھی بھی سرانجام نہیں دے سکتے تھے چنانچہ آگے چل کر شبلی کے افکار نہ صرف علی گڑھ کے باہر کے لوگوں نے قبول کر لئے بلکہ بقول اکرام صاحب "(علی گڑھ) کے بعض با اثر طلباء نے وہی خیالات اخذ کر لئے جو شبلی، ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی اور ان کے دوسرے رفقاء تھے اور سر سید کے خیالات کی عین ضد تھے"[۶] ظاہر ہے یہ تبدیلی محض اس وجہ سے آئی کہ

---

[۴] مکاتیب شبلی (حصہ اوّل) مرتبہ سید سلیمان ندوی۔ اعظم گڑھ۔ بار دوم ۱۹۲۸ء۔ ص ۵۱۔
[۵] شیخ محمد اکرام۔ موجِ کوثر۔ فیروز سنز (لاہور، پشاور، کراچی) بار دوم ۱۹۵۸ء ص ۵۵-۲۵۴۔ [۶]

کالج کو جس بلند مقصد کے حصول کے لئے ذریعہ بنایا گیا تھا وہ مقصد پورا نہ ہو سکا چنانچہ اسی مقصد کے حصول کے لئے شبلی کو علی گڑھ چھوڑ کر ندوہ کی بنیاد رکھنا پڑی۔

اتنا معلوم ہونے کے بعد کہ شبلی کو کیوں ایک الگ ادارے کی ضرورت محسوس ہوئی، اب ہم ان کی تعلیمی آراء سے بحث کریں گے، اور یہ دیکھیں گے کہ "ندوۃ" میں انھوں نے اپنے خیالات و آراء کو کس حد تک عملی جامہ پہنایا۔

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، شبلی جدید علوم اور انگریزی زبان کے دلدادہ تھے اور ان کا حصول مسلمانوں کے لئے لازم سمجھتے تھے کیونکہ بقول ان کے" تعلیم میں جب تک یورپ کی کسی زبان کی تعلیم لازمی نہ قرار دی جائے اور زمانہ موجودہ کے علوم و فنون نہ پڑھلائے جائیں اس وقت تک مذاق حال کے موافق کیونکر اربابِ قلم پیدا ہو سکتے ہیں"[ے] شبلی کی طرح سر سیّد احمد خان بھی جدید علوم[⊕] کے حصول کے لئے رستہ ہموار کر رہے تھے لیکن دونوں کے طریقۂ کار اور مقصد میں بڑا فرق تھا۔ سر سیّد کا خیال یہ تھا کہ مسلمان مذہب کے سوا ہر چیز میں انگریز بن جائیں جبکہ شبلی کا مقصد یہ تھا کہ صحیح اسلامی عقائد و اخلاق کی حفاظت اور بقاء کے ساتھ ساتھ نئے زمانہ کی صرف مفید باتوں کو قبول کیا جائے[شہ] بالفاظ دیگر ایک ترقی کی خاطر یورپ کی ہر قسم کی نقالی پر آمادہ تھے جبکہ دوسرے صرف مفید چیزوں کو اپنانا چاہتے تھے۔ شبلی کو ایک طرف اگر جدید تعلیم یافتہ طبقے کی مذہبی معلومات اور جدید علوم کے مرکز کے کردار پر افسوس تھا تو دوسری طرف انہیں قدیم مدارس کی خستہ حالی کا بھی فکر دامن گیر تھا چنانچہ اس وقت جبکہ آپ علی گڑھ ہی میں تھے، قدیم تعلیم پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے "سفر نامہ روم و مصر و شام" میں رقمطراز ہیں:-

"آجکل . . . . تعلیم قدیم کی ابتری پر عموماً رنج اور افسوس کیا جاتا ہے لیکن میرا افسوس دوسری قسم کا افسوس تھا۔ ہمارے ملک کے نئے تعلیم یافتہ پرانی تعلیم پر رنج اور افسوس ظاہر کرتے ہیں وہ

ے مقالاتِ شبلی (جلد ہشتم) ص ۴۸

⊕ سر سیّد کے تعلیمی نظریات کے لئے ملاحظہ کیجئے ماہنامہ "فکر و نظر" بابت جنوری ۱۹۷۰ء

شہ حیاتِ شبلی صہ ۲۹۰

درحقیقت سچ نہیں بلکہ استہزا اور شماتت ہے. میں اگرچہ نئی تعلیم کو پسند کرتا ہوں اور دل سے پسند کرتا ہوں تاہم پرانی تعلیم کا سخت حامی ہوں اور میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کی قومیت قائم رہنے کے لئے پرانی تعلیم ضروری اور سخت ضروری ہے. اس کے ساتھ جب یہ دیکھتا ہوں کہ یہ تعلیم جس طریقہ سے جاری ہے وہ بالکل بے سود اور بے معنی ہے۔" [۹]

سرسیّد احمد خان کے آراء کے بالکل برخلاف شبلی نعمانی کا یہ خیال تھا کہ جدید تعلیم کا حصول اور انگریزی زبان کا سیکھنا اگرچہ لازم ہے لیکن یہ علوم اس انداز سے نہ ہوں کہ مسلمانوں کو اپنے علوم اور اپنے مذہب سے بے راہ رو کردے۔ جہاں تک انگریزی زبان کا تعلق ہے تو اس کے سیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے. اس کا علم اس حد تک ہو کہ ایک عالم انگریزی زبان جان کر یورپ میں اسلام کی نشر و اشاعت کر سکے اور یہ کہ مستشرقین جو آئے دن کم علمی کی بنا پر یا دانستہ طور پر اسلام کے شعائر کو غلط انداز میں پیش کرتے رہتے ہیں، ان کا رد لکھ کر اسلام اور اسلامی تعلیمات میں دلچسپی لینے والوں کے سامنے حقائق پیش کر سکیں۔ انگریزی تعلیم کی اس سے زیادہ ان کے ہاں کوئی اہمیت نہیں تھی۔ کیونکہ بقول شبلی" انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں سے . . . مذہبی خدمات یعنی امامت، وعظ اور افتاء کا کام لینا نہیں ہے۔" [۱۰] لیکن اگر انگریزی زبان اور جدید علوم ایک مسلمان عالم کو اس قابل نہ بنا سکیں کہ وہ کسی جدید زبان میں مذہب اسلام کی تعلیم و تلقین کر سکے تو ایسے سب علوم و فنون بے کار ہیں. شبلی ایک طرف اگر علوم جدیدہ کی مقصدیت پر زور دیتے ہیں اور رائج الوقت تعلیم میں، جو اس وقت مشرق کے بعض ممالک میں پروان چڑھ رہی تھی، خامیوں کی طرف اشارہ کرتے رہے، تو دوسری طرف انہوں نے قدیم پیشوایانِ دین کو بھی تنبیہہ کردی کہ وہ جدید علوم اور یورپی زبانوں کی بلاوجہ مخالفت ترک کردیں جدید علوم کی مفید چیزوں کو اپنانے میں کوئی قباحت نہیں لیکن اگر ہمارے پیشوایانِ دین ان ضرور تور کو رفع نہ کریں گے اور اب بھی یہ فتویٰ جاری رکھیں گے کہ ان (علوم و) زبانوں کا سیکھنا ناجائز ہے تو ان کو منصب مقتدائی چھوڑ دینا چاہیئے اور علیحدہ ہونا چاہیئے۔" [۱۱]

---

[۹] شبلی نعمانی۔ سفرنامہ روم و مصر و شام (اعظم گڑھ جولائی ۱۸۹۴ء) ص ۷۰

[۱۰] مقالاتِ شبلی (جلد اوّل) ص ۱۴۰ وبعد۔ [۱۱] ملاحظہ ہو شبلی کی وہ تقریر جو انھوں نے اجلاس لکھنؤ ۱۹۱۲ء میں کی تھی۔ روداد ندوۃ العلماء (اجلاس لکھنؤ ۱۹۱۲ء) ص ۳-۱۰۲

شبلی کے ہاں جدید علوم اور یورپ کی زبانوں کی اہمیت تو اپنی جگہ تھی لیکن مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں کی اہمیت دوسری ساری چیزوں پر فوقیت رکھتی تھی۔ ترقی کی خاطر اگر مشرقی علوم اور عربی تعلیم قربان گاہ کی بھینٹ چڑھا دیا گیا" تو پھر مسلمان، مسلمان رہیں گے کہاں؟ جن کی ترقی کے لئے یہ جدو جہد ہو رہی ہے۔"[۱۲] آپ مولوی بشیر الدین صاحب کی اس رائے سے بالکل متفق نہیں تھے کہ "مجدد اعظم (سر سید) ۔ ۔ ۔ ۔ انگریزی علوم و فنون کی تعلیم کو مسلمانوں کی تمام دینی اور دنیاوی ترقی کا وسیلہ سمجھتے تھے"۔ اور لکھتے ہیں کہ "کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ انگریزی علوم و فنون میں ملکہ حاصل کرنا اور مذہبی علوم اور عربی زبان سے بے بہرہ ہونا تمام دینی اور دنیاوی ترقی کا وسیلہ ہے۔ اگر یہی مطلب ہے تو یہ سر سید پر بہتان ہے۔ سر سیّد کی ہرگز یہ رائے نہیں تھی لیکن اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ عربی اور مذہبی تعلیم میں کامل ہونا تمام دنیوی اور دینی ترقی کا وسیلہ ہے تو بالکل درست ہے۔"[۱۳]

علی گڑھ سے مایوسی کے بعد مولانا شبلی نے "ندوۃ" کی تحریک کا آغاز بھی اس خیال سے کیا تھا کہ قدیم وجدید کا ایسا سنگم بنے جہاں دونوں دریاؤں کے دھارے آکر ملیں۔ اور جہاں نہ صرف "دیوبند" کی کمی پوری ہو بلکہ علی گڑھ کے نصاب میں مذہبی تعلیم کی جو کمی ہے وہ بھی پوری ہو۔[۱۴] شبلی کے نزدیک نصاب تعلیم مرتب کرتے وقت یہ اصول پیش نظر رکھنے ضروری ہیں ورنہ پورا ڈھانچہ ہی گر کر تباہ ہونے کا اندیشہ ہے۔ وہ رہنما اصول یہ ہیں[۱۵]: (۱) تعلیم سے مقصود یہ ہے کہ نفس فن حاصل کیا جائے (۲) فن کے حصول کا عمدہ طریقہ یہ ہے کہ اس فن کے مسائل کو منفرداً اور بہ استقلال حاصل کیا جائے تاکہ اس

---

[۱۲] حیاتِ شبلی ص ۲۹۲ و بعد

[۱۳] مقالاتِ شبلی (جلد ہشتم) مقالہ "البشیر اور ندوۃ العلماء" ص ۱۱۳ و بعد۔

[۱۴] اس بات کی طرف اشارہ ان کے مضمون "ندوۃ العلماء کیا کر رہا ہے" میں موجود ہے جہاں انھوں نے لکھا ہے کہ ندوۃ العلماء کے یہ فرائض ہیں (۱) علماء میں ایثار نفس پیدا کرنا (۲) انگریزی دان علماء پیدا کرنا۔ (۳) مذاق حال کے موافق علماء کے گروہ میں مقررین اور ارباب قلم کا پیدا کرنا اور (۴) ایسے علماء کا پیدا کرنا جو غیر ممالک میں اسلام کی اشاعت کر سکیں۔ (تفصیلات کیلئے دیکھئے مقالاتِ شبلی (جلد ہشتم) ص ۶۲)

[۱۵] مقالاتِ شبلی (جلد اوّل) ص ۱۲۶ و بعد۔

فن کی طرف کافی توجہ ہو سکے۔ بجائے اس کے اگر چند فنون کے مسائل کو مخلوط کر کے حاصل کیا جائے گا تو کسی فن کی اچھی طرح تکمیل نہ ہو گی (۳) متعدد علوم و فنون کی تحصیل میں الاقدم فالاقدم کا خیال ضروری ہے یعنی یہ کہ جو فنون مقصود بالذات ہیں ان کے حاصل کرنے میں زیادہ وقت صرف کیا جائے جو مقصود بالعرض ہیں ان میں کم، اسی طرح علوم مقصود بالذات میں بھی بلحاظ اہمیت کے فرق مراتب کرنا چاہیئے یعنی جو علوم زیادہ مہتم بالشان اور ضروری ہیں وہ زیادہ توجہ کے قابل ہیں۔ (۴) ہر علم کی تحصیل میں سب سے مقدم یہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ اس فن کی جو غایت ہے وہ حاصل ہو۔

جن رہنما اصولوں کو شبلی نے بنایا ہے ان کی روشنی میں وہ جب ہندوستان میں مروجہ نصاب تعلیم کو دیکھتے ہیں تو اس میں " اکثر کتابیں ایسی ہیں جن میں نفس مسائل کے علاوہ نہایت کثرت سے لفظی مباحث ہوتے ہیں جن کا مدار کسی کتاب کے خاص الفاظ پر ہوتا ہے یعنی اگر اصل مسئلہ کو دوسرے الفاظ میں بیان کیا جائے تو وہ تمام مباحث بیکار ہو جاتے ہیں، جن میں متعدد فن مخلوط ہیں اس خلط مبحث کی وجہ سے طالب علم کا ذہن پریشان ہوتا ہے یہاں تک کہ اس کو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ کونسا فن حاصل کر رہا ہے۔ بہت بڑی غلطی یہ ہے کہ جو علوم مقصود بالعرض ہیں ان کو مقصود بالذات بنا لیا گیا ہے اور زمانۂ تحصیل کا بڑا حصہ انہیں کے حاصل کرنے میں صرف کر دیا جاتا ہے۔"

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، ندوۃ کے قائم کرنے کی سب سے بڑی ضرورت نصاب تعلیم کی اصلاح اور قدیم تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید علوم اور انگریزی زبان کا اجراء تھا۔ انگریزی زبان کے اجراء میں تو انہیں شروع شروع میں بڑی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا لیکن آخر کار ان کو کامیابی حاصل ہو گئی اور انگریزی زبان" ندوۃ " میں رائج کر دی گئی۔ اب شبلی کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ انگریزی زبان کے ساتھ کس قدر مذہبی تعلیم ضروری ہے؟ چونکہ اس طبقہ سے امامت، وعظ و افتاء کا کام تو لینا نہیں تھا بلکہ اس طبقہ کے لوگوں کو اسلام کے ضروری مسائل سمجھانا اور تاریخ اسلام سے ضروری واقفیت پیدا کرنا تھا لہٰذا شبلی کے نزدیک یہ ضروری سمجھا گیا کہ ایسے لوگوں کے لئے ایک مختصر اور جامع سلسلہ کتب دینیہ مرتب کیا جائے جس میں سکول سے کالج تک سلسلہ وار کتابیں ہوں جو تین قسم کی ہوں یعنی فقہ، عقائد، تاریخ اسلام فقہ و تاریخ کے لئے تو انہوں نے مصر میں چھپی ہوئی کتابوں کے ترجمہ پر اکتفا کیا البتہ عقائد کے بارے میں انہیں یہ مشکل پیش آئی کہ مصر کی کتابوں کو انہوں نے ناکافی اور ناقابل

سمجھا۔ اور ہندوستانی کتابوں کو اس لئے مجوزنہ کرسکے کہ ابھی ان پر" تمام لوگوں کا اتفاق نہیں ہوسکتا۔" بہتر یہی سمجھا گیا کہ اسکولوں میں صرف فقہ اور تاریخ اسلام نیز سادہ عقائد کی تعلیم ہو اور کالج کی کلاسوں میں امام غزالی اور ابن رشد اور شاہ ولی اللہ صاحب کی چیدہ تصنیفات خود عربی زبان ہی میں پڑھائی جائیں۔ لیکن ایک بات جس پر شبلی بہت زور دیتے رہے وہ یہ تھی کہ کالجوں میں صرف کتابی تعلیم سے مذہبی اثر پیدا نہیں ہوسکتا بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ طلباء کے چاروں طرف مذہبی عظمت کی تصویر نظر آئے۔

شبلی اگرچہ تعلیم میں اصلاح کی ضرورت پر زور دیتے تھے لیکن وہ ان مصلحین میں سے تھے جو آہستہ آہستہ اصلاح اور اس کے اچھے نتائج کے حق میں تھے۔ لیکن ان علماء کو جو کسی قسم کی اصلاح کی ضرورت خیال نہیں کرتے تھے، اصلاح پر مجبور نہیں کرتے تھے۔ یہاں ان کا استدلال یہ تھا کہ اگر ایک طرف مسلمانوں کو انگریزی زبان اور انگریزی علوم سکھا کر مغرب کے غیر مسلموں کے حملوں کی مدافعت اور اسلام کے پرچار کے لئے تیار کیا جائے تو دوسری طرف انگریزی نہ پڑھنے والوں کے کام بھی بہت بڑے ہیں:-

"مذہبی کاموں کا دائرہ بہت وسیع ہے مثلاً دیہات کے جاہل مسلمانوں میں احکامِ اسلام کا پھیلانا اتنا بڑا وسیع کام ہے جس کے لئے سینکڑوں ہزاروں مولویوں اور واعظوں کی ضرورت ہے۔ اسی طرح مساجد کی امامت اور فتویٰ وغیرہ بہت سے کام ہیں جو محض خالص قدیم تعلیم یافتہ حضرات انجام دے سکتے ہیں اس لئے تقسیمِ عمل کی رُو سے یہ کام اسی گروہ کے ہاتھ میں دے دینے چاہئیں اور ہر طرح پر ان کی تائید و اعانت و احترام کرنا چاہیئے۔" [۱۶]

ظاہر ہے کہ شبلیؒ اسلام کی سربلندی اور باہمی اخوت کے رشتوں کو مضبوط کرنے کے لئے دونوں گروہوں میں کوئی تفریق نہیں کرتے تھے خیال اگر تھا تو صرف اتنا کہ قدیم طرز پر تعلیم پانے والے لوگوں کی اس طرح تربیت ہو جس سے تعصب، سخت دلی اور تنگ خیالی

۱۶۔ مقالاتِ شبلی (جلد اوّل) ص ۱۴۳

پیدا نہ ہو اور جدید تعلیم یافتہ اور قدیم تعلیم یافتہ ایک ہی محفل میں بیٹھ کر ایک دوسرے کو اپنا حریف نہ سمجھیں۔

پورے ہندوستان کے نصابِ تعلیم کو ایک سطح پر لانے کے لئے اور علماء کے باہمی نزاع وتفریق کو ختم کرنے کے لئے شبلی نے ندوۃ العلماء کے تیسرے جلسے (منعقدہ ۴ ۲ر اپریل ۱۸۹۴ء) سے دیگر تجاویز کے علاوہ یہ تجویز بھی پاس کرائی کہ مدارس اسلامیہ کے مہتمم یا ان کے نمائندے ہر سال ندوۃ العلماء میں شریک ہوں اور یہ کہ مدارس اسلامیہ کو آپس میں مربوط کرنے کے لئے دیوبند، مدرسہ فیض عام کانپور، مدرسہ احمدیہ وغیرہ کو دارالعلوم کی حیثیت دی جائے اور دوسرے چھوٹے مدارس کو ان کی شاخیں قرار دے کر انہیں دارالعلوم کی نگرانی میں دیا جائے۔ [۱۷]

شبلی نے "ندوۃ" سے جو امیدیں وابستہ کی تھیں اور وہ اس سے جو کام لینا چاہتے تھے، انہیں شاید اس میں کامیابی ہو جاتی لیکن ان کی زندگی نے وفا نہ کی۔ دوسری طرف ان کے جانشین ان کی اصلاحی روح کو آگے بڑھانے میں وہ توازن واہتمام باقی نہ رکھ سکے جو ان کی خصوصیت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ندوۃ جو علی گڑھ کی خامیوں کی اصلاح کے ساتھ قدیم وجدید کا حسین امتزاج پیدا کرنا چاہتا تھا، اپنے راستہ سے ہٹ کر محض قدامت کا علمبردار بن کر رہ گیا۔

---

[۱۷] حیاتِ شبلی ص ۳۰۷ - ۸